باسمہ تعالیٰ۔ رب زدنی علما

قرآن کا سماجی شعور کیا ہے؟

انسان اپنی تخلیق سے لیکر اب تک اپنی تمدنی اور سماجی زندگی میں جن مراحل سے گذرا ہے اس میں اس کی چار فطری حیثیتیں تمام انسانی دنیا میں مسلم رہی ہیں۔ قرآن حکیم نے انسان کی ان چار حیثیتوں کے حدود قرائن کا واضح تعین کیا ہے جس سے وہ اپنی صالح اور کامیاب زندگی کے ساتھ صالح وفلاحی معاشرہ تشکیل دے سکے۔ فرد، خاندان، قوم اور بین الاقوامیت کی ان چار حیثیتوں کی ہیئت ترکیبی کا توازن قرآن کی رو سے اسطرح سامنے آتا ہے:

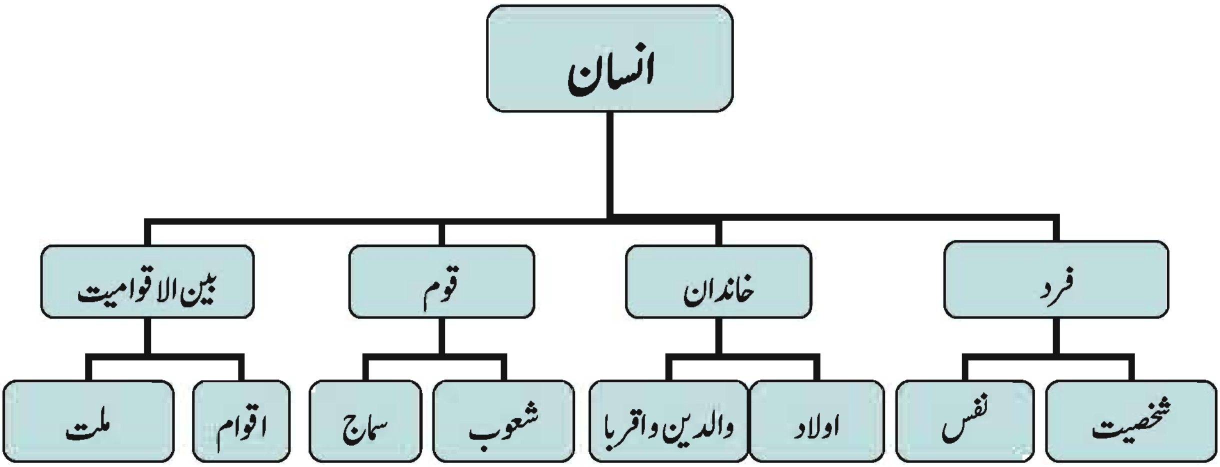

سماجی زندگی کی پہلی اکائی۔ فرد

قرآن حکیم میں انسانی شخصیت، انسانی شعور اور نفس انسانی کیلئے نفس ہی کی اصلاح استعمال ہوئی ہے۔

انسانی شخصیت

انسان اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ لاتعداد مخلوقات میں سے ایک ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی اکثر مخلوقات پر فضیلت دی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (الاسراء۔۷۰)

"اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو بحر وبیابان میں سواری دی اور پاکیزہ رزق عطا کیا اور اپنی کئی مخلوقات پر فضیلت دی۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تخلیق کو کئی اوصاف سے نوازا ہے۔ انسانی شخصیت بنیادی طور پر انہی اوصاف کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ انسان کی شعوری کیفیت ہے جو سوچنے سمجھنے، تدبر کرنے کی صلاحیت یا غور و فکر سے تعبیر ہے، جس سے انسان ایک باشعور مخلوق بنتا ہے۔ انسان کی تکریم میں بحر و بیابان میں سواری کا ذکر انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت عظمت انسان کی طرف اشارہ ہے۔ اسلئے حضرت شاہ رفیع الدین انسان کی تعریف یوں کرتے ہیں :

وما یتفکر ویصنع بالآلات انسان ارضیا

ترجمہ : "جو عقل سے سوچتا ہے اور آلات کی مدد سے اشیاء بناتا ہے، وہ اس زمین پر بسنے والا انسان ہے۔" (تکمیل الاذہان ص ۲۵)

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی شخصیت ایک مستقل اکائی ہے اور وہ دنیا و آخرت میں اپنے کسب کا خود ذمیدار ہے :

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝٣٨ (مدثر 38)

ہر نفس اپنے کسب (اعمال) کے عوض گروی ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ۔ (انفطار ۔19)

جس روز کوئی نفس کسی دوسرے نفس کا بھلا نہ کر سکے گا، اس روز صرف اللہ کا حکم ہو گا۔

نفس انسانی

قرآن حکیم کے مطابق انسانی شخصیت کا دوسرا حصہ انسانی نفس / نفس ہے۔ یہ دوسرا حصہ انسان کی طرف سے زمین پر اپنے خلافتی کردار کی ادائیگی کیلئے اپنی رضا سے حاصل کردہ امانت ہے جس پر انسان مکمل دسترس رکھتا ہے۔ یہ امانت نفس انسان کو مکمل متوازن حالت میں پیدائش کے وقت عطا ہوتی ہے۔ جو انسان اس امانت کو اللہ کے حضور پہنچانے میں کامیاب رہا اور اس کا توازن بگڑنے نہیں دیا وہ کامیاب و کامران ہو گا۔ اور جس نے اس توازن کو بگاڑ دیا وہ ناکام و نامراد ہو گا۔ اس توازن کے قائم رہنے کا بنیادی انحصار رزق حلال کے حصول اور انسانی نفع بخشی پر ہے۔ ان دونوں افعال سے نفس انسانی کا توازن برقرار اور مستحکم رہتا ہے۔ جبکہ ظلم سے خواہ اس کی نوعیت کسی بھی قسم کی ہو اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ یہ ظلم یعنی خلاف عدل کام کتنا بھی معمولی کیوں نہ ہو کسی نہ کسی درجے میں نفس کے توازن پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ توازن جتنا زیادہ بگڑتا جائے گا آخرت میں کامیابی کے امکانات اتنے ہی کم ہوتے چلے جائیں گے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں اہل ایمان کو نفس کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر انسان اعمال صالح کرتا رہے اور رزق حلال پر کاربند رہے تو ایک منزل ایسی آجاتی ہے جہاں انسان اپنے رب سے اور اس کا رب اپنے بندے سے راضی ہو جاتا ہے۔ یہ منزل قرآن کی اصطلاح میں نفس مطمئنہ کہلاتی ہے جو انسانی زندگی کا منتہا اور مقصود ہے۔

سماجی زندگی کی دوسری اکائی۔ خاندان

قرآن حکیم نے خاندانی زندگی میں اولاد، والدین اور اقرباء کے ساتھ رویوں اور تعلقات کی ضرورت و نفاست پر بہت زور دیا ہے۔ اس میں اولاد اور اقرباء کے ساتھ رویوں اور تعلقات میں صلۂ رحمی کی کے احکامات ہیں۔ لیکن والدین کے ساتھ انتہائی مہربانی اور احسان کا حکم دیا گیا ہے.

اولاد

یہ رشتہ انسانی فطرت کی گہرائیوں سے جڑا ہوا ہے، اس کے باوجود انسان اس رشتہ میں بھی افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک خوف میں اولاد کے قتل تک تیار ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس کی محبت میں اپنے خالق ورب سے بیگانہ ہو کر اپنا تعلق کمزور بنا دیتا ہے۔ اس لئے قرآن حکیم میں انسان کو اولاد کے حوالے سے خوف اور محبت کے توازن کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، فرمایا:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ (الاسراء 31)

"اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔"

جو لوگ مفلسی کے ڈر سے اپنی زیادہ اولاد کی پیدائش کو روکتے ہیں یا بیٹوں کیلئے وسائل بچانے کی غرض سے اپنی بیٹیوں کو پیدا ہونے نہیں دیتے، یا قتل کر دیتے ہیں، وہ لوگ انسانیت کے بہت بڑے مجرم ہیں۔ کچھ لوگ مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو کام سے لگا دیتے ہیں اور تعلیم و تربیت نہیں دلاتے یہ بھی قتل کے مترادف ہے۔

دوسری طرف فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ⑨

(المنافقون-9)

"اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ کی یاد و فرمانبرداری سے غافل نہ کر پائیں اور جو ایسا کرے گا تو وہی گھاٹے میں پڑنے والے لوگ ہیں۔"

انسان اپنے مال کو دگنا کرنے کے پیچھے اور اپنی اولاد کے بے کنار مستقبل کے چکر میں دنیاداری کی دلدل میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ اس کو خالق و پروردگار خدا سے اپنا تعلق کمزور پڑتا ہوا دکھائی نہیں دیتا اور اس طرح دلدل میں پھنس کر اپنا خسارہ کر بیٹھتا ہے۔ اس لئے اولاد کیلئے فکرمندی بھی اتنی ہی کرنی ہے کہ جس سے انسان اس چکر میں خدا سے اپنے رشتے توڑ نہ بیٹھے۔

والدین

خاندان میں انسان کے اوپر والدین کا احترام و خدمت سب سے پہلا حق ہے اور ان سے احسان کرنے کا حکم ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ
حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَ
أَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٥﴾ (الاحقاف-15)

"اور ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے۔ اس کی ماں نے تکلیف کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ اس کو جنا۔ اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا اور چالیس برس کو پہنچ گیا تو وہ کہنے لگا اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیرے احسان کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔"

یہاں ہر طرح سے خدمت کرنے کی تاکید ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ:

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا
أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ﴿٢٣﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي
صَغِيرًا ﴿٢٤﴾ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ ۚ إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا ﴿٢٥﴾ (الاسراء-23-25)

"تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنا ورنہ تو مذموم اور بے کس ہو کر رہ جائے گا۔ اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو ان کو اف نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور ان کے سامنے نرمی سے عجز کے بازو جھکا دو اور کہو کہ اے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم نیک رہو گے تو وہ توبہ کرنے والوں کو معاف کر دینے والا ہے۔"

اقربا

قرآن حکیم نے انسان کی مفید اور موثر عملی زندگی کیلئے عدل و احسان کے رویوں کے ساتھ ساتھ اقربا سے صلہء رحمی کا حکم بڑی اہمیت سے واضح کیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ (النحل-90)

"بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا"

آدمی جس طرح اپنے بیوی بچوں کی ضرورت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس کو پورا کرتا ہے، اسی طرح وہ دوسرے عزیز واقارب کی ضرورت کے بارے میں بھی حساس ہو۔ ہر صاحب استعداد شخص اپنے مال پر صرف اپنا اور اپنے گھر والوں کا ہی حق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کو بھی وہ اپنی لازمی ذمہ داری میں شامل کرے۔ قرآن نے انفاق کو ایمان کا لازمی حصہ قرار دیا ہے اور جہاں بھی انفاق کے مصرف کا بیان کیا اس میں والدین کے بعد اقربا کو خرچ کے مصارف میں شریک کرنے کا حکم دیا۔ عزیز واقارب کیلئے ان کی طرف سے طلب اور سوال کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ خود اپنی ذمہ داری سے یہ فرضِ منصبی ادا کرنا چاہیے۔ پھر یتیم، مساکین، مسافروں پر خرچ کرنے کا حکم ہے، اور یہ بھی صلہ رحمی کے درجے میں ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢١٥﴾ (البقرہ-215)

"لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو مال تم خرچ کرو تو اس میں حق ہے تمہارے ماں باپ کا اور رشتہ داروں کا اور تیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا۔"

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۗ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الروم-38)

"پس رشتہ داروں کو ان کا حق دو اور مسکین کو اور مسافر کو۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کیلئے جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کیلئے فلاح وسلامتی جو محفوظ قلعہ بتایا ہے اس کا راستہ لازمی طور پر خرچ کرنے کی شاہراہ سے گذرتا ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ رزق کی فراوانی ملتی ہی اس بنیاد پر ہے کہ اس میں والدین، تیموں، مساکین اور مسافروں کا حق ہے۔ جس نے وہ حق ادا گی کی اللہ کی رضا بھی پائیں گے اور اس کی رحمت و برکت سے بھی بہرہ ور ہونگے۔

سماجی زندگی کی تیسری اکائی۔ قوم

قوم

قوم انسانی سماج کا تیسرا اجتماعی ادارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے تعارف کے لئے اقوام کا وجود اپنی مشیت قرار دیا ہے۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات-12)

آپ کو قومیں اور قبائل بنایا گیا تا کہ پہچانے جاؤ۔ (ترجمہ امام راغب اصفہانی)

انسان کی تمدنی زندگی کے ان دواداروں قوم اور قبیلہ کے ذریعہ انسان کی پہچان قائم رہنا از بس ضروری ہے۔ لیکن یہ دونوں شناختیں انسان کی تکریم اور عظمت کی بنیاد نہیں ہیں۔ اسلئے فرمایا گیا: ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اللہ کے ہاں تم میں سے تکریم والا وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ قرآن نے تمدنی زندگی میں انسانوں کے تیسرے ادارے قوم کی تشکیل کی بنیاد زبانیں بتائی ہیں، فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراهیم-4)

"اور ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا اس قوم کی زبان میں بھیجا"

پھر ان زبانوں کا مختلف ہونا بھی اللہ تعالیٰ نے اسطرح کمال قدرت سے اپنے شعائر میں سے شمار کیا ہے جس طرح خود زمین و آسمانوں کی تخلیق اس کے کمال قدرت سے تخلیق ہوئی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ (الروم-22)

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری بولیوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی افرادی آزادی عزیز ہے۔ تاکہ وہ نیکی و بدی اور حق و باطل کے دو راستوں کے انتخاب میں مجاز بن سکیں۔ بلکل اسی طرح اقوام کی آزادی بھی اللہ تعالیٰ کو عزیز ہے تاکہ قومیں کسی جبر و غلامی کے بغیر اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے فطری طریقوں پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اس لئے انسانی تاریخ میں جب بھی افراد و اقوام پر غلامیاں مسلط ہوئیں، اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں اور مصلحین کے ذریعہ ان غلامیوں سے نکالنے کے مواقع عطا کیے۔ تمام انبیاء کی اس جہد کے تفاصیل سے قرآن مجید میں جابجا ذکر موجود ہے۔ بنی اسرائیل کے اوپر فراعین مصر کی مسلط کی ہوئی غلامی ختم کرنے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو جدوجہد کی پورے قرآن میں اس کا بار بار تذکرہ ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی دربار میں واشگاف الفاظ میں بنی اسرائیل کی آزادی کا اعلان کیا:

فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ ؕ (الاعراف 105)

اللہ تعالیٰ کو افراد و اقوام کی یہ آزادیاں آزاد رائے کے فطری حق کے استعمال کیلئے پسندیدہ ہیں تاکہ بہتر شخصیت و سماج کی تشکیل ممکن ہو سکے۔ اس کے بعد ہی افراد اس لائق ہو سکتے ہیں کہ وہ فرد کی حیثیت میں بہتر خاندان اور اقوام کی حیثیت میں بہتر ملت قائم کرنے کے مقاصد حاصل کر سکیں۔

سماج

انسانوں کی آبادی جو قبیلوں اور قوموں سے تشکیل پاتی ہے، قرآن حکیم میں اس کے لئے "القریۃ" یا "القریٰ" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ امام راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں: "القریۃ وہ جگہ ہے جہاں لوگ جمع ہو کر آباد ہو جائیں تو بحیثیت مجموعی ان دونوں کو قریہ کہتے ہیں۔" (ص۸۴۶)۔ انسانوں کے اجتماع اور ان کی وقوعہ کو انفراداً بھی قریہ بولا جاتا ہے۔

انسانی آبادیوں کو راہِ ہدایت پر چلانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکے بعد دیگرے پیغمبر اور مصلح آتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں وحی کی تعلیم کے ذریعہ انسانی سماج کے تمام افراد، رشتوں، اداروں کو چلانے کیلئے مکمل رہنمائی کی۔ جو معاشرے وحی کی اس تعلیم کو قبول کرتے رہے، انہیں امن، سلامتی اور اطمینان نصیب ہوا۔ لیکن جن معاشروں نے اس تعلیم کو ٹھکرا کر اپنی سرکشی اور مفادات کے تحفظ کیلئے ظلم و ناانصافی کا راستہ اختیار کیا، قدرت نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ (ھود-102)

"اور تیرے پروردگار کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے جب وہ انسانی آبادیوں کو ظلم کرتے ہوئے پکڑتا ہے۔ یقینا اس کی پکڑ بڑی ہی دردناک، بڑی ہی سخت ہے۔"

تمام انسانی آبادیوں اور معاشروں میں ہادی اور نذیر بھیجے گئے۔ ان کو باقاعدہ مہلت دی گئی۔ اس کے باوجود جب وہ ظلم و ناانصافی کی تمام حدود پھلانگ گئے تو ہلاکت ان کا مقدر بن گئی۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (القصص-59)

"اور (یاد رکھو تمہارے پروردگار کا قانون یہ ہے کہ) وہ کبھی انسانوں کی بستیوں کو (پاداش عمل میں) ہلاک نہیں کرتا، جب تک کہ ان کی مرکزی بستی میں ایک پیغمبر مبعوث نہ کر دے اور خدا کی آیتیں پڑھ کر نہ سنا دے۔ اور ہم کبھی بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں صرف اس حالت میں کہ ان کے باشندوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کر لیا ہو۔"

قرآن حکیم ایسے ظالم معاشرہ کو تبدیل کرنے کی طرف بلاتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ڌ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء-75)

”اور تم کو کیا ہوا کہ تم نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کیلئے جو کہتے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی حمایتی کھڑا کردے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار کھڑا کردے۔“

قرآن حکیم نے مستضعفین اور مستکبرین کے دو طبقے واضح کر کے بتائے ہیں کہ مستکبرین کا طبقہ اللہ کے باغیوں اور سرکشوں کا طبقہ ہے جو اس کے بندوں کو غلام بنا کر ان کے وسائل اور محنت کا استحصال کر کے ظلم کرنے والا بن جاتا ہے۔

ایسے میں ان مستضعفین یعنی کمزوروں کی طاقت کو منظم کر کے اس ظالمانہ سماج کو بدل کر انصاف و عدل کا معاشرہ قائم کرنے کیلئے قرآن حکیم کے صاف صاف احکامات ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے بندے آزادی، اطمینان اور سلامتی کے ساتھ اس کی اطاعت و رضا کیلئے خود حوالگی کر سکیں۔ ایسا معاشرہ جو طاقت کے زور پر انسانوں اور اقوام کو غلامی و جبر میں رکھے یا کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کو طبقاتی غلامی کے ماتحت لے آئے، ان دونوں صورتوں میں ہر قسم کی مزاحمت کے طریقے اختیار کرنا قرآن کے ماننے والوں کیلئے بیحد ضروری ہیں۔ اور اگر جنگ کے بغیر یہ کسی بھی صورت میں ممکن نہیں تو قرآن نے آیت مذکورہ میں نہ صرف اس آخری اقدام کا مطالبہ کیا ہے بلکہ ظلم کے خلاف اس جنگ کو فی سبیل اللہ ہی قرار دیا ہے۔

جب تک سماج میں ظالمانہ نظام کے تبدیلی کی یہ کوششیں جاری رہتی ہیں اس وقت تک اللہ تعالیٰ پورے سماج کو مہلت دیتے ہیں کہ شاید کبھی یہ لوگ اپنی حالت بدلیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ذات ان سعادت مندوں کی حفاظت فرماتی ہے جو اس بھلائی کے کام میں سرگرم ہوتے ہیں۔ لیکن جب اکثریت کسی بھی صورت میں تبدیلی کیلئے تیار نہیں ہوتی تو پھر قانون خداوندی کے تحت ان کو مجرم ٹھہرا کر اپنے انجام سے گذارا جاتا ہے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾ (ھود 117–116)

”پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کے قوموں میں ایسے اہل خیر ہوتے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے۔ ایسے تھوڑے لوگ نکلے جن کو ہم نے ان میں سے بچا لیا۔ اور ظالم لوگ تو اسی عیش میں پڑے رہے جو انہیں ملا تھا اور وہ مجرم تھے اور تیرا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ناحق تباہ کردے حالانکہ اس کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔“

سماجی زندگی کی چوتھی اکائی۔ بین الاقوامیت

اسلام میں اقوام کا وجود انسانوں کے تعارف کیلئے مثبت اور مشیت خداوندی کا تقاضا ہے۔ لیکن اسلام اقوام کو مستقل درجہ دینے کے ساتھ ساتھ ان کو ایک بین الاقوامیت میں عمل گیر رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس عمل سے ملت کی صورت میں وسیع انسانی اجتماعیت قائم ہو سکے۔

اقوام

اللہ تعالیٰ کو جس طرح اپنے بندوں کی انفرادی غلامی استحصال اور غیر اللہ کی عبدیت پسند نہیں، اس طرح انسانوں کے منظّم ترین تمدنی اجتماع "قوم" کی غلامی اور استحصال بھی ہرگز منظور نہیں۔ اس لئے طاقت و جبر کی بنیاد پر جب بھی انسانوں کو محکوم بنایا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے بعض کیلئے بعض کے ذریعے مدافعت کروا کے اقوام کی آزادی اور خلاصگی کے اسباب بنائے ہیں۔ قرآن حکیم میں کہا گیا ہے:

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾

(الحج۔40)

"اور (دیکھو) اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا۔ (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم و تشدد کرنے کیلئے بے روک چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادتگاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں، گرجے، عبادتگاہیں، مسجدیں جس میں کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔"

قرآن حکیم نے تمدنی زندگی میں اقوام کی شناخت اور تعارف کے ساتھ عدل و انصاف پر عمل پیرا رہنے کی تاکید کی ہے تاکہ کسی طور پر بھی ان کی خواہشوں، ان کے مفادات اور ان کی ضرورتوں کا احتیاج اور طلب اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ وہ دوسری قوموں کے ساتھ انصاف کرنا چھوڑ دیں۔ اسلئے فرمایا:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾

(مائدہ۔8)

"اور (دیکھو!) ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات کیلئے ابھار دے کہ (اس کے ساتھ) انصاف نہ کرو۔ (ہر حال میں) انصاف کرو یہی تقوے سے لگتی ہوئی بات ہے۔ اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔"

ملت

دین الٰہی کی اصل نوع انسانی کی وحدت واخوت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جتنے رسول بھی دنیا میں آئے سب نے یہی تعلیم دی تھی کہ تم سب اصلا ایک امت ہو اور تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ اسلیئے تم سب کو چاہئے کہ اسی ایک پروردگار کی بندگی کریں۔

قرآن حکیم کہتا ہے کہ ابتداء میں تمام انسان قدرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت۔ پھر ایسا ہوا کہ نسلِ انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے اور ان اختلافات میں تفرقہ اور ظلم و فساد کی صورت اختیار کرلی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا اور ہر زبردست زیردست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو ضروری ہوا کہ نوعِ انسانی کی ہدایت اور عدل و صداقت کے قیام کے لئے وحی الاہی کی روشنی نمودار ہو، چنانچہ یہ روشنی نمودار ہوئی اور خدا کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۚ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ (بقرہ-213)

"ابتداء میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا) بس اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا۔ وہ (نیک عملی کے نتائج کی) بشارت دیتے اور بدعملی کے نتائج سے) متنبہ کرتے۔ نیز ان کے ساتھ "الکتاب" (یعنی وحی الٰہی سے لکھی جانے والی تعلیم) نازل کی، تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے، ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو۔"

قرآن حکیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت سے استشہاد پیش کرتا ہے کہ جس طرح وہ دین حق کی راہ پر تمام نوع انسانی کیلیئے خدا کی موحدانہ پرستش اور نیک عملی کی زندگی کی مثال تھا، اسے اپنے لئے حجت بناؤ۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (البقرہ-135)

"اور یہودی کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ نصاریٰ کہتے ہیں نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ (اے پیغمبر) تم کہو نہیں! (اللہ کی عالمگیر ہدایت تمہاری ان گروہ بندیوں کی پابند نہیں ہو سکتی)۔ ہدایت کی راہ تو وہی حنیفی راہ ہے جو ابراہیم کا طریقہ تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔"

قرآن حکیم نے امت واحدہ کی تشکیل کے لئے امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ ذمیداری عائد کر دی کہ وہ انسانیت کو معروف (سلامتی کے اقدار) سے بہرہ ور کریں اور منکر (ہلاکت کے مظاہر) سے بچائیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (آل عمران 110)

”تم بہترین امت ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے کہ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

انسان کو زمین پر خلیفہ بنا کر نیابت الٰہی عطا کی گئی ہے۔ نیابت الٰہی کی ذمیداریوں کا تعلق انسان کی اپنی انفرادی زندگی سے زیادہ اجتماعی زندگی سے ہے، اس لئے قرآن حکیم نے انسانوں کی اجتماعیت کو قائم رکھنے کیلئے وحدت انسانیت اور وحدت دین کو ہر حال میں برقرار رکھنے کی تلقین ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (نساء۔1)

”اے انسانو! اپنے پروردگار (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو۔ وہ پروردگار جس نے تمہیں اکیلی جان سے پیدا کیا (یعنی باپ سے پیدا کیا) اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا (یعنی جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوتا ہے، لڑکی بھی پیدا ہوتی ہے) پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی (اور رشتوں اور قرابتوں کا بہت بڑا دائرہ ظہور میں آگیا)۔ پس دیکھو جس کے نام پر ایک دوسرے سے (مہر والفت کا) سوال کرتے ہو۔ قرابت داری کے معاملہ میں بے پرواہ نہ ہو جاؤ۔ یقین رکھو کہ اللہ تم پر (تمہارے اعمال کا) نگہبان ہے۔“

قرآن نے انسانیت کی اس وحدت کو قائم رکھنے کے لئے ایمان کے مرکزی نکات اور عمل کیلئے ”المعروف“ اور ”المنکر“ کی تفاصیل بھی بیان کردی ہیں۔ معروف عرف سے ہے جس کے معنی پہچاننے کے ہیں۔ پس ”معروف“ وہ بات ہوئی جو انسانوں کی سلامتی و فلاح کیلئے جانی پہچانی بات ہو۔ ”منکر“ کے معنی انکار کرنے کے ہیں۔ یعنی ایسی بات جس سے انسانی ہلاکت کے محرکات و مظاہر کے طور پر انکار کیا گیا ہو۔ قرآن نے نیکی اور برائی کیلئے یہ الفاظ اس لئے اختیار کیے کہ وہ کہتا ہے دنیا میں عقائد و افکار کا کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے اچھے ہونے پر سب کو اتفاق ہے اور کچھ باتین ایسی ہیں جن کے برے ہونے پر سب متفق ہیں۔ مثلاً اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے، جھوٹ بولنا برا ہے۔ اس میں سب کا اتفاق ہے۔ دیانتداری اچھی بات ہے، بددیانتی برائی ہے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ماں باپ کی خدمت، ہمسایہ سے سلوک، مسکینوں کی خبر گیری، مظلوم کی دادرسی انسان کے اچھے اعمال ہیں اور ظلم اور بدسلوکی برے اعمال ہیں۔ گویا یہ وہ باتیں ہوئیں جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے اور جن کے خلاف جانا عام طور پر قابل انکار واعتراض ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب، دنیا کے تمام اخلاق، دنیا کی تمام حکمتیں دنیا کی تمام جماعتیں دوسری باتوں میں کتنا ہی

اختلاف رکھتی ہوں، لیکن جہاں تک ان اعمال کا تعلق ہے سب ہم آہنگ و ہم رائے ہیں۔ اسلیے انسانیت کی ان سچائیوں پر وحدت انسانیت قائم کی جائے، تاکہ انسانیت کی فوز فلاح کے اعلیٰ مقاصد حاصل ہو سکیں۔

قرآن کہتا ہے انسانیت کی سچائیوں پر مشتمل یہی راہ عمل نوع انسانی کیلئے خدا کا ٹھہرایا ہوا فطری دین ہے۔ یہی سیدھا اور درست دین ہے جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں۔ یہی "دین حنیف" ہے، جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "الاسلام" ہے۔ یعنی خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کی فرمانبرداری۔

قرآن حکیم نے دین کیلئے "الاسلام" کا لفظ اس لئے اختیار کیا ہے کہ "الاسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرمانبرداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے دین کی حقیقت ہی ہے کہ خدا نے جو قانون سعادت انسان کیلئے ٹھہرایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات صرف انسان کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کی بقا و قیام کیلئے خدا نے کوئی نہ کوئی قانون عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحے کیلئے بھی رو گردانی کریں تو کائنات ہستی درہم برہم ہو جائے۔

خدا پرستی کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے جو انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانہ پھر آباد کر سکتا ہے۔ یہ اعتقاد کہ ہم سب کا پروردگار ایک ہی ہے اور ہم سب کے سر اسی ایک چوکھٹ پر جھکے ہوئے ہیں، وحدت انسانیت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ممکن نہیں انسان کے بنائے ہوئے تفرقے اس پر غالب آ سکیں۔